© rasailojaraid.com

احمد ندیم قاسمی

ایک ثقافتی، علمی اور فکری جائزہ

کشور سلطانہ

احمد ندیم قاسمی علمی و ادبی دنیا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ متنوع موضوعات کے شاعر، صاحب طرز افسانہ نگار، کامیاب ڈرامہ نویس اور روشن دماغ صحافی ہیں۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ہر کتاب کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں گہرا ربط ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز اور خارجی ماحول کے اثرات نے ان کو زندگی کے حقائق سے قریب تر کر دیا ہے۔ ان کا موضوع سخن زندگی ہے جو نکہت فشاں، رقصاں، جواں، بے کراں بھی ہے اور بے بس، بے چین، افسردہ اور سرگرداں بھی۔ وہ ایک شائستہ انسان، سنجیدہ شاعر اور شگفتہ بیاں ادیب ہیں ان کے اسلوب بیاں اور طرز نگارش میں ایک انفرادیت ہے جس نے ان کی تحریروں کو ممتاز بنا دیا ہے۔ انسان دوستی ان کی شاعری کا محور ہے۔ وہ انسانیت کے ہر دکھ کو اپنا ذاتی دکھ سمجھتے ہیں اور یہ احساس ان کی فکر اور شخصیت میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اس کو ان کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ انسانی اقدار، خدا ترسی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے علمبردار ہیں۔ ان کی شخصیت میں ترقی پسندی اور قدامت پسندی کا حسین امتزاج ہے۔ جس معاشرے میں انہوں نے آنکھ کھولی اس کے حسن و قبح پر ان کی گہری نظر ہے۔ کسی مسئلے پر رائے زنی کرتے وقت صحت و توازن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے پاکستانی ادب اور معاشرے میں ان کو ایک نمایاں اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حوصلہ اور ضبط نفس ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ نہ صرف شاعری بلکہ ان کے افسانوں میں بھی پریم چند کی طرح دیہاتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

یوں تو ان کی ہر شاعرانہ خوبی پر تفصیلاً بحث کی جا سکتی ہے لیکن اس مضمون میں احمد ندیم قاسمی کی چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاعرانہ خوبیاں بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے ہر وہ بات کہہ دیتے ہیں جو وہ محسوس کرتے ہیں یعنی ان کی شاعری احساس و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے ضروری سمجھتی ہوں کہ احمد ندیم کا مختصر سا تعارف کراتی چلوں۔

حالات زندگی اور تخلیقات

احمد ندیم قاسمی ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پنجاب میں خوشاب کے قریب انگہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔[۱] آپ کا خاندانی نام احمد شاہ ہے اور ادبی نام قاسمی ہے اور تخلص ندیم ہے۔ آپ تین بہن بھائی تھے۔ ایک آپ سے بڑی بہن تھی۔ جن کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ بڑے بھائی کا نام پیرزادہ محمد بخش ہے جو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور آج کل فیصل آباد میں مقیم ہیں۔ والد کا انتقال آپ کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ تینوں بہن بھائی بہت چھوٹے تھے۔ اس زمانے میں تنہا عورت کا تین بچوں کو پالنا مشکل تھا لہٰذا گھر میں فاقے ہونے لگے لیکن خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ندیم خود اس بارے میں کہتے ہیں۔

> میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضعداری قائم رکھنے کے لئے ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے۔[۲]

آپ نے ابتدائی تعلیم انگہ کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ آپ نے پرائمری کا امتحان ۱۹۲۵ء میں پاس کیا تو آپ کے ایک چچا جو سول آفیسر تھے، ان کو اپنے ساتھ (کیمبل پور) اٹک لے آئے۔ جہاں سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ شفیق چچا کی صحبت میں ندیم کو مذہبی، علمی اور شاعرانہ ماحول میسر آیا اور ان کی قابل رشک تربیت ہونے لگی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۹ء میں اپنی سروس کا آغاز کیا اور محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر ہو گئے اور تقریباً اڑھائی سال کے بعد ۱۹۴۲ء میں آپ مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد آپ ہفت روزہ رسائل پھول اور تہذیب نسواں کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ ادب لطیف کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۴ء میں سالنامہ ادب لطیف کی بنا پر آپ گرفتار ہوئے۔ مئی ۱۹۴۵ء کو آپ جیل سے رہا ہوئے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں آپ اس رسالے کی ادارت سے دست بردار ہو گئے۔ آپ نے کچھ عرصہ ماہنامہ سویرا میں بھی کام کیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے ریڈیو پاکستان پشاور میں ڈیڑھ سال ملازمت کی۔ پھر ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر نقوش کی ادارت سنبھالی لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ رسالہ بھی سیفٹی ایکٹ کا شکار ہو گیا۔ اب ۵ مارچ ۱۹۵۳ء سے روزنامہ امروز کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔[۳]

آپ نے اردو اور عربی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے عربی کے اکابر شعراء کا مطالعہ کیا۔ فارسی کی طرف آپ کچھ عرصے بعد راغب ہوئے اور مرزا غالب تک کے تمام شعراء کو آپ نے پڑھا۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد کے علمی کارناموں کے علاوہ اردو میں علامہ محمد اقبال اور فارسی میں عرفی سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ اردو تراجم کے ذریعے یا انگریزی کے توسط سے آپ نے ہومر اور افلاطون سے لے کر ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ تک کو پڑھ ڈالا۔ نیز روس، فرانس، جرمنی اور انگلستان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ وار مطالعہ کیا۔ مشہور برطانوی ناولسٹ برٹرینڈ رسل آپ کو بہت پسند ہے اگرچہ اس کی بعض باتوں پر آپ کو اعتراض بھی ہے۔ تاریخ میں آپ ابن خلدون اور ٹائن بی کا اب تک نہایت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں قائداعظم کی استقامت اور ماوزے تنگ کا علمی اور عملی تجربہ بہت عزیز ہے۔ وہ قرآن مجید سے بے حد متاثر ہیں۔ اور مجدد الف ثانی، ابو الکلام آزاد، شبلی نعمانی اور اقبال کی مذہبیات سے متعلق تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی جدید اردو شاعری کے ایک اہم ستون ہیں۔ ان کی پیدائش جنگ عظیم اول کے دوران ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں جب وہ اپنے والد کے انتقال کے دو سال بعد اپنے چچا کے پاس اٹک (کیمبل پور) چلے گئے۔ تو پنجاب میں حالی اور اقبال زیادہ مشہور تھے مگر شرکائے محفل اقبال کو باہر نکال پھینکنے کے درپے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال جن تہذیبی اور سیاسی اقدار کے عاشق تھے۔ ان سے ان مغرب زدگان کی بیزاری اور تشکیک اب باغیانہ رویئے میں بدلنے لگی تھی اور یہ لوگ اپنی الگ محفلیں سجانے لگے۔ اس کے برعکس ندیم اس طرح کے کسی منفی رویہ کو اپنانے کی بجائے انتہائی مثبت انداز میں اس محفل کی فضا کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے میں کوشاں رہے۔ چنانچہ ندیم نے اقبال کی عظمت سے انکار کرنے کی بجائے ایک گونہ عقیدت کے ساتھ اقبال کی عظمت کی فکری اور جمالیاتی بنیادوں کو سمجھنے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا رویہ اپنایا۔ ان کے علاوہ ان کے کانوں میں جن شعراء کا کلام پڑا ان میں حسان بن ثابت، سعدی، غالب اور حافظ شامل ہیں۔ لیکن ندیم کی شاعری کو قومی جذبے، خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے کی تڑپ اور زبوں حال معاشرے کی تیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و تار شب کے بعد مہر درخشندہ کی نمود نے نغمگی سے زیادہ فیصلہ کن ادعایت سے مالا مال کیا ہے۔

یہ انداز نظر اس گہری اور عملی روحانیت کا کرشمہ ہے جس کے گہوارے میں ندیم نے آنکھ کھولی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مغرب کے مادی نظریات کی یلغار سے ہماری شاعری انتہائی خطرناک بحران میں مبتلا تھی۔ ندیم کا مادی اعتبار سے بے آب و گیاہ مگر جمالیاتی اور روحانی حیثیت سے سرسبز و شاداب ماحول میں پرورش پانا ہماری شاعری اور تہذیب کی خوش بختی ہے۔ تپتے ہوئے ویرانوں میں اپلے چنتا ہوا، میلے کپڑوں کی پوٹلی اٹھائے، جھیل کی تلاش میں بل کھاتی پتھریلی راہوں پر سرگرداں اور سکول جانے سے پہلے سیاہی کے لئے ایک پیسہ نہ پاسکنے پر روتا ہوا، اماں کی آنکھوں سے رواں آنسو دیکھنے والا شخص باپ کے بارے میں سوچتا ہو گا۔ اس بچے کو رہ رہ کر عشق حقیقی کی ان منزلوں کا دھیان آتا ہو گا جن کی دھن میں ان کا باپ سرگرم سفر تھا۔ اس کی ماں کا یہ ایثار کتنا حیات پرور تھا کہ اپنے مصائب کو مصائب ہی نہ جانتی تھی بلکہ اشکوں کی ہر بوند کے ساتھ اترنے والے فرشتوں کے ذریعے اللہ کو پیغام بھجواتیں کہ ان کے بچوں کا پروردگار ہونے کا حق ادا کرے اور دوسری طرف ان کے چچا، ان کی دنیا کے ساتھ ساتھ عاقبت سنوارنے میں یوں محو رہتے تھے کہ ندیم کو پرائمری ہی میں تفسیر حقانی کا درس دینے لگے اور وہ بھی ان چچا جان سے جو میر حسن کے شاگرد اور اقبال کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ یہ ہی وہ کردار ہیں جو ندیم کی تعلیم و تربیت میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کی شخصیتیں محبت، معصومیت اور تقدس سے عبارت ہیں اور جن کی بدولت ندیم کی ادبی زندگی کو جلا ملی اور انہوں نے محمد علی جوہر کی وفات پر مرثیہ لکھا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۱۵ سال تھی جو کہ ان کے ایک عظیم شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔ ندیم کا یہ مرثیہ اردو شاعری کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور اختر شیرانی کی رنگین مزاج مگر سطحیت زدہ رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں ندیم کا جوہر کی موت سے متاثر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی ہی میں قومی مصائب سے راہ فرار اختیار کرنے والے آوارہ نوجوانوں کے برعکس قومی مصائب سے دلچسپی رکھتے تھے۔[۴]

احمد ندیم کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جس سے ہر ادب شناس واقف ہے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ دھڑکنیں (قطعات) بعد میں ترمیم و اضافوں کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں رم جھم کے نام سے شائع ہوئی۔

۲۔ جلال و جمال (نظمیں اور غزلیں)، ۱۹۴۶ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ شعلہ گل (نظمیں اور غزلیں)، ۱۹۵۳ء

۴۔ دشت وفا (نظمیں، غزلیں اور قطعات) ۱۹۶۳ء

۵۔ محیط (شعری مجموعہ)، ۱۹۷۶ء

۶۔ دوام (شعری مجموعہ)، ۱۹۸۰ء

۷۔ لوح خاک (شعری مجموعہ)، ۱۹۸۸ء

ان مجموعوں کو پڑھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی کی شاعری زندگی کی ترجمان و عکاس ہے۔ زندگی جو زمین کی گہرائیوں سے لے کر آسمان کی وسعتوں تک پھیلی نظر آتی ہے اور جس کی رگوں میں جذبات و افکار کا ہجوم اور خواہش عمل گردش کرتی رہتی ہے۔ زندگی کے یہی جواہر جب مسرت و انبساط، تجسس اور اضطراب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو احساس کا خلوص اور شدت انہیں شعروں کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ یہ شعر کبھی زمین سے تعلق کا حوالہ بن جاتے ہیں تو کبھی زمین کے باسیوں کے باہمی رشتوں کی کہانی، کبھی حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کے لئے ایک لمبے سفر کی روداد اور کبھی زندگی کو توانائی بخشنے والے پرخلوص جذبات کی رم جھم۔[۵]

خصوصیات

رم جھم (۱۹۴۴ء) قاسمی کے شعری مجموعے کا وہ ترمیم شدہ ایڈیشن ہے جو پہلے دو مرتبہ "دھڑکنیں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ موجودہ مجموعے میں نہ صرف یہ کہ شاعر نے اشعار اور قطعات کو ایک نئی ترتیب بخشی ہے۔ بلکہ اس میں پرانے ایڈیشن کے مقابلے میں بہت سے خوبصورت اضافے کئے ہیں۔ اگرچہ کتاب میں کہیں بھی نئے اور پرانے کی تخصیص نہیں کی گئی۔ مگر موضوعاتی پھیلاؤ اور ہمہ گیری کے اعتبار سے ایک فکری اور فنی ارتقاء کی صورت واضح ہوتی ہے۔ جہاں تک قطعات کا تعلق ہے تو آغاز میں قاسمی صاحب خود کہتے ہیں کہ "ابتدائی دور کے قطعات کے افسانوی خصوصیت اور ان میں موجود کہانی کا عنصر ماند پڑ گیا ہے اور غیر شعوری طور پر اس کی جگہ جذبے یا تاثیر کی وحدت نمایاں ہو گئی" اگرچہ کتاب کا بڑا حصہ قطعات کی نذر کیا گیا ہے مگر اس نئے ایڈیشن میں خوبصورت رباعیات، چند مختصر نظمیں اور فرانسیسی شاعری کی منفرد صنف "ترائیلے" کے چار نمونوں کے علاوہ صنف گوئی بھی شامل ہے۔ کسی بھی موضوع یا خیال کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان کے لئے اس کے امکانات محدود محسوس نہیں ہوتے۔ اس میں شاعر کی شعوری کوششوں کو بھی دخل ہے جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے "کہ غنائیت محض جیتے جاگتے فن کی ایک بڑی خامی ہے۔ قطعہ اور رباعی ایسی دلاویز اصناف ہیں کہ ان کو ایک تنگ روایتی دائرے میں محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ ان کی مخصوص ہیئت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ایک فیصلہ کن صنف کے طور پر استعمال کیا جانا چاہئے۔

احمد ندیم قاسمی کی ہمہ جہت شخصیت میں ان کی شاعرانہ زندگی باقی تمام پہلوؤں پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ وہ دردمندی اور دلسوزی ہے جو ان کے شعروں میں رچی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر یہ دردمندی کسی مایوسی یا بے بسی میں نہیں ڈھلتی، بلکہ زندگی کے ہر پہلو اور فطرت کے تمام گوشوں سے حاصل کی ہوئی خوبصورتی اور حسن کی بدولت نغمۂ محبت بن جاتی ہے۔ یہ شاعرانہ حیثیت ان کے لئے خود اپنی ذات کے عرفان اور قابل فخر ذریعہ پہچان ہے۔[6]

ایک مدت کے بعد آج مجھے
ہم زبان ماننے لگے ہیں لوگ

پہلے روتے تھے، چونکتے ہیں اب
مجھ کو پہچاننے لگے ہیں لوگ

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کر چراغ

بحیثیت شاعر وہ اپنے تخیل کی اڑانوں کو غیر محدود کر دینے کے خواہش مند ہیں۔ اس لئے کہ

زندگی اب حشر موضوعات ہے
اور ہر موضوع کے عنوان ہزار

کس کو اپناؤں، نہ اپناؤں کسے
زندگی پر ہے مرے فن کا مدار

یوں زندگی کے ساتھ ایک ربط سا قائم ہو جاتا ہے۔ جو اس کائنات اور پھر اپنی ذات پر اعتماد کو بحال اور پختہ تر کر دیتا ہے۔ زندگی کے ساتھ یہ دو طرفہ رابطہ اور تعلق شاعری کا رہین منت ہو جاتا ہے۔ شاعر ایک طرف زندگی کے تخلیقی تجربے سے قوت حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے جذبات و احساسات کے بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بدولت اپنے ساز جاودانی سے زندگی کے رازوں اور ممکنات سے پردہ اٹھاتا ہے۔[۷]

میرے جذبات میرے پاسباں ہیں
میرے افکار میرے رازداں ہیں

مرے بس میں ہے تقدیر دو عالم
مری زد میں زمین و آسماں ہیں

زندگی کا یہ سفر' شاعری کے ذریعے طے کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ بلاشبہ اس راستے میں کئی موڑ اور دوراہے بھی آتے ہیں اور منزل کا غیرواضح تصور ذہن میں ابہام بھی پیدا کرتا ہے۔ ندیم کی شاعری میں آزار سفر کی ایک ایسی روداد ملتی ہے جو محبت سے توانائی حاصل کرتی ہے۔ اور بظاہر جسے زندگی کی تکالیف یا گلستان کے خاردار راستوں سے کوئی سروکار نہیں مگر جوں جوں فکری و ارتقاء کی منزلیں طے کرتی جاتی ہے تو زندگی مضطرب' بے چین' بے کل' سرگرداں شکل میں بھی سامنے آتی ہے۔ شعروں میں موجود سوز' دردمندی اور غمگی' صدائے احتجاج یا انقلاب میں بدل جاتی ہے مثلاً[۸]

جسے ہر شعر پر دیتے تھے تم داد
وہی رنگین نوا خونیں نوا ہے

اب ان رنگوں کے نیچے دھیرے دھیرے
لہو کا ایک دریا بہہ رہا ہے

مگر سفر کے اس موڑ پر محبت یا چین محض بے معنی تصورات نہیں بن جاتے بلکہ فطرت کا حسن تخلیق اور انسانی صحت کی توانائی' معاشرے میں موجود انتشار اور اضطراب کی فضا کو تعمیری اور مثبت ارتقاء میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مناظر فطرت کے حسن اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی عظمت کے ساتھ معاشرتی اور اقتصادی تفاوت بھی ذہن اور سوچ کو متاثر کرتا ہے' قاسمی صاحب خود لکھتے ہیں "میں رومانوں اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کرسکا۔ جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں۔ دھوکہ' ظلم اور استحصال جب بلا امتیاز رنگ و نسل تمام دنیا کے کمزور انسانوں کا مقدر ہے تو اس کے خلاف اٹھی ہوئی آواز میں بھی آفاقیت ہونی چاہئے۔ انسانی عظمت تمام انسانوں کا حق ہونا چاہئے۔"[۹]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر جب قاسمی انسان کی عظمت کو ایک بار تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر وہ خالق کے ساتھ اس کی کسی بھی قسم کی بحث و تکرار کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ ساری ذمہ داری انسان پر ڈال رہے ہیں وہ کہتے ہیں۔ انسان کی تمام تر الجھنیں اور دکھ اپنی جگہ ہیں لیکن اس کی نیکی اور عظمت کی اہمیت الگ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ صلہ کی پرواہ کئے بغیر انسان نیکی کرتا چلا جائے۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں ذات کے اظہار کا بے ساختہ پن بھی ہے۔ محض شعر کی ہیئت اور خیال کا تجرباتی امتزاج نہیں۔ ان کے یہاں روپ ہے بہروپ نہیں۔ ان کی شاعری محبت کی شاعری ہے۔ ان کا شعوری ارتقاء کوئی ایسا تکنیکی عمل نہیں۔ جس میں نئے خیالات اور نئے اسالیب کی دریافت پرانے طرز کو ختم کر دے۔ "رم جھم" کے وہ قطعات جو بظاہر محض افسانوی رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں' درحقیقت وہ زمین فراہم کرتے ہیں جس سے شاعر کا خمیر اٹھتا ہے۔ ان کے ذہن میں رومانیت کی ملائمت رچی ہوئی ہے۔ وہ محبت کی طاقت سے آشنا ہیں وہ جس ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ دیہات کی سادہ لوحی' سچے اور پر خلوص جذبات اور پاک شفاف جھرنوں کے مانند' کدورتوں اور منافقتوں سے پاک دلوں پر مشتمل ہے۔ فطرت کا قرب اور انسان کی بحیثیت انسان درجہ بندی ان کے رویوں کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ فطری سادگی اور بے ریا زندگی گزارنے والے شبیہیں ان کے دماغ پر نقش ہیں۔ چاند' ستارے اور دیگر مظاہر قدرت شعروں کی شکل میں بیان کئے گئے ہیں۔ کہ کائنات کا حسن اور ابدیت زندگی کو حسین تر بنا رہی ہیں۔[9]

اداس چاند نے بدلی کی آڑ میں ہو کر
کنارے ملگجے بادل کے کر دیئے روشن
شب فراق میں جیسے تصور رخ دوست
دل حزیں کے اندھیرے میں روشنی کی کرن
پھیکی پھیکی چاندنی ہو' ہلکا ہلکا ابر ہو
ایک گھاٹی میں ہوں بل کھاتے ہوئے جھرنے رواں
چار سو پھولوں کی خوشبو سے غنودہ ہو فضا
اور اکتارے پہ لہراتی ہوں تیری انگلیاں

ان میں اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر قطعات و رباعیات میں زبردست نغمگی اور غنائیت ملتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماحول کی سادگی اور خوبصورتی کو بیان کرتے وقت آپ کا انداز بالکل ایک فنکار کا سا ہوتا ہے۔ لفظوں کا موزوں انتخاب و ارتباط ان کے تکنیکی جادو کو ہر سمت پھیلا دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نہ صرف یہ کہ ہم وہاں موجود ہیں بلکہ ان زندہ کرداروں کی خوشی اور غمی کو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

صاف کھلیان پہ غلے کا سنہری انبار
چار سو بیٹھے ہیں دہقان، تھکے ہارے سے
ڈوبتے چاند کے ہالے میں ہوں جیسے تارے
روئے روئے سے پریشاں سے، بے چارے سے"
(رم جھم)

زمین کے ساتھ گہرا اور ابدی رشتہ وہاں کے باسیوں کے مسائل اور طرز زندگی ان کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ اس اہم تعلق کو پروفیسر مجتبیٰ حسین نے "ارض تصوف" کا نام دیا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو دل و نظر کی آلائشوں اور تہذیب نو کی کھوکھلی چکاچوند سے انسان کو بچائے رکھتا ہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں سر پر سائبان اور پیروں تلے زمین قائم رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت کا احساس اور باہم دردمندی کی ضرورت یہ شعر پڑھ کر شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

بادشاہوں کی معطر خواب گاہوں میں کہاں
وہ مزا جو بھیگی بھیگی گھاس پر سونے میں ہے
مطمئن لوگوں کی اجلی مسکراہٹ میں کہاں
لطف جو اک دوسرے کو دیکھ کر رونے میں ہے"
(دشت وفا)

احمد ندیم قاسمی کو فطرت سے ہمیشہ ایک گہرا لگاؤ رہا ہے۔ جواب بھی ان کی نظموں سے اکثر جھلکتا رہتا ہے یہ لگاؤ ایک ایسے شاعر کا ہے کہ جس نے کھلی فضا میں سانس لیا ہے۔ ان کی شاعری کے قطعات کے پس منظر میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جو قطعے کے آخری مصرعے تک پہنچتے پہنچتے ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ بقول ضیا جالندھری "یہاں احمد ندیم قاسمی شاعر نے احمد ندیم قاسمی افسانہ نویس کے اشتراک سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔" علامہ اقبال نے تہذیبی اور فکری مسائل، اختر شیرانی نے محبت اور رومان اور جوش نے انقلاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مذہب کے بارے میں جو کچھ کہا اس سے پیدا ہونے والی خاص فضا سے آپ نے نمایاں اثرات قبول کئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال کے ردعمل کے طور پر اختر شیرانی کی ہلکی پھلکی رومانی شاعری خاص طور پر نوجوان لکھنے والوں میں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ کسی حد تک قاسمی صاحب نے بھی شیرانی کا اثر قبول کیا مگر اقبال سے دامن چھڑا کر نہیں۔ بلاشبہ علامہ اقبال کا مقام اتنا بلند اور ان کے فلسفہ ذات و حیات اور اس کے عملی تقاضوں کی ہمہ گیریت ایسی ہے کہ اس سے قطع نظر کرنا ممکن ہی نہیں۔ رم جھم کے مندرجہ ذیل اشعار اس عظیم مفکر کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

نہ بیش و کم کا جہنم، نہ زشت و خوب کا زہر
نہ اتباع مرے منفرد خیالوں میں
وہ شاعری جو محبت سے بہرہ یاب رہی
کبھی الجھ نہ سکی منطقی سوالوں میں

قاسمی کی شاعری میں زندگی کے متنوع تجربات کی مختلف سطحیں ان کے عصری شعور کے مختلف زاویوں کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی شاعری بعض جگہ خود کلامی سے بھی کام لیتی ہے لیکن اس سے زیادہ وہ اپنے ہم عصر سے خطاب کرتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی کیفیات کی متعدد شاعرانہ تصویروں کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں متعدد تصویریں افسانے کی دلچسپی اور داستان کی رنگینی لئے ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ قاسمی کی شاعری نے افسانہ خیزی سے کام لیا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے تمام ہمعصروں سے زیادہ شاعرانہ کیفیتوں کو افسانوی موڑ دیئے ہیں اور بعض اوقات پورے افسانے کی تعمیر کر دی ہے۔ ان کے بعض اشعار، بعض نظموں اور بعض قطعات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم نہ صرف ایک افسانوی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں بلکہ خود بھی اس منظر کا ایک حصہ بن کر اس کے گرد و پیش کے ایک کردار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کی افسانہ طرازی کے بعض پہلو نمایاں دلچسپی کے حامل ہیں۔ مثلاً

چاند نکلا ہے سرِ بام لب بام آؤ   دل میں اندیشہ انجام نہ آنے پائے

فقر و فاقے میں مر گیا شاعر   شعر اہل نظر کے کام آیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غم جاناں غم دوراں کی طرف یوں آیا　　جانب شہر چلے دختر دہقاں جیسے

(جلال و جمال)

قاسمی کی شاعری نے اپنے دور کے عوام کے میلانات و توقعات کو خوبصورت شاعرانہ بیان عطا کیا ہے۔ عام زندگی سے تاثرات قبول کرنے کے بعد وہ ان کو شاعرانہ صورت دے کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے انسان کے علم اور انسانیت کی آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس آگہی کے لئے بھی ان کے رابطہ عصر نے ضروری بنیاد فراہم کی ہے کہ اس کے بغیر نہ ان کا تصور فن مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی جلا پاتا ہے۔ یہی عرفان عصر انہیں چابک دستی عطا کرتا اور فنی انتخاب و تنظیم کے لئے معیار بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں استعارے نے تصور اور تصور نے استعارے کا پیکر جس طرح اختیار کیا ہے وہ خود اس دور کے اجتماعی تلازمات کا نتیجہ ہے۔ وہ اس دور جس میں ہمیں محبت کے ساتھ نفرت، مجبوری کے ساتھ اختیار اور شرافت کے ساتھ قہر کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ندیم کی شاعری اس میں زندگی کی سانسیں بھرتی ہے اور اس کے تضادات شاعرانہ نقوش میں ڈھلتے ہیں۔ قاسمی کی شاعری اس کو تسلیم کرتی نظر آتی ہے۔

میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعداء کے لئے قہر و قیامت ہوں میں

احمد ندیم قاسمی کے فن خصوصاً ان کی شاعری میں اپنے عصر کی جدوجہد سے جو قول و قرار کا عنصر ملتا ہے۔ وہ ایک پوری نسل کی دین ہے۔ جس نے زندگی کے روشن مستقبل پر یقین رکھنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا سیکھا تھا۔ چنانچہ جب احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ

جو ترانہ کہ تلوار کے وار سے بیچ میں کٹ گیا اک سبق بن گیا
خون جو جذب ہوتا رہا خاک میں صبح نو کے افق کی شفق بن گیا
نوجوان فن طرازوں کی لاشوں سے پھوٹی وہ کونپل جو اب ایک گلزار ہے
یہ تعطر جو اٹھکیلیاں کر رہا ہے اسی گل کدے ہی کی مہکار ہے

تو وہ اپنے دور کی ایک زندہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ اس شعور عصر کو ایک مفروضے یا کلیئے کی طرح بیان کرنے کی بجائے انفرادی احساس عصر کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ نفسیاتی لہروں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سماجی شعور کی سطحوں میں جمالیاتی توازن قائم رکھنے کا فن بھی جانتے ہیں اسی لئے ان کی آواز کسی پہاڑ کی بلندی سے نیچے آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے زمین کی سطح سے بلند ہو رہی ہے اسی لئے اس آواز میں پیار، اپنائیت اور انسیت کی کیفیت اپنے تمام ہمعصروں سے زیادہ ہے۔ اس نسل نے جسے انسانیت کے مستقبل پر یقین تھا اور جس کے سرمایہ یقین سے قاسمی نے بہت کچھ اکتساب کیا ہے، تخلیقی عمل کے جو چراغ روشن کئے تھے ان سے آج بھی نظریں منور ہیں۔[۱۲]

ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ذہنی شکستوں سے واسطہ رکھتے ہوئے بھی لمحہ بے یقینی کی بجائے زیادہ وسیع تصور عصر کو پیش کرتی ہے پھر قاسمی کا رویہ بعض مغربی شاعروں اور ان کے مقلد اردو شاعروں کی طرح مخالف تہذیب رویہ نہیں۔ وہ اب تک کی تہذیبی میراث کو رد کر دینے کی بجائے اپنے دور کے تہذیبی عوامل کو پیش کرتے ہوئے وہ گذشتہ روایات کے ان عناصر کو بھی قبول کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے اور مزاج کا جزو بن گئے ہیں۔

معنوی صراحت قاسمی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ صراحت و وضاحت بھی ان کے جمہوری مزاج کا جزو ہے کیونکہ وہ جمہور ہی کو اپنی شاعری کا مخاطب سمجھتے ہیں جن تک اپنی بات پہنچانا ضروری ہے۔ وہ ایک جگہ کھل کر اپنے ادبی منشور کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے

یہ سچ ہے کہ شاعر میں خواب بینی کا جزو بھی شامل ہوتا ہے لیکن اس خواب بینی کی بنیاد زندگی کی حقیقتوں پر ہوتی ہے۔ قاسمی کی شاعری ترانہ بیداری ہوتے ہوئے خواب بینی کا یہ جز بھی رکھتی ہے۔ اس کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعرانہ احساس کو ایسی حقیقی صورتوں کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ خواب و بیداری کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔

انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

قیام پاکستان کے وقت وحشت و بربریت کی انتہا دیکھنے کے باوجود قاسمی پر امید تھے۔ دراصل قاسمی انسان کو کسی چھوٹے مقام پر دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ سب میں اچھائی ڈھونڈتے ہیں اس لئے کہ وہ خود ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑے انسان ہیں اور وہ بڑے انسان اس لئے ہیں کہ سب انسان ان کو دوستوں کی طرح عزیز ہیں اور وہ سب کے لئے اسم بامسمی ہیں۔ حسد و عناد کے الفاظ ان کی لغت میں موجود نہیں ہیں۔ بعض اوقات تو ندیم کے زندگی گزارنے کے صاف ستھرے اصولوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی ساری انتہاؤں کو سمجھ لیا ہے لیکن یہ انتہا آج ہی نہیں دیکھی آج ہی نہیں سمجھی بلکہ آج سے ۴۰ سال پہلے ۲۳ سالہ نوجوان قاسمی بھی بڑی خود اعتمادی سے ہمیں یہ کہتا نظر آتا ہے۔

برے بھلے کی مجھے خود خبر ہے میرے بزرگ
کہ اپنے کاتب اعمال کا مشیر ہوں میں

پھر جوں جوں قاسمی کے حوصلے غم زمانہ سے نبرد آزما ہوتے رہے ان کی آواز میں مایوسی کی بجائے ایک فاتح کی گونج پیدا ہوتی گئی

تباہیوں سے خود آگاہیاں نچوڑی ہیں
کلائیاں غم ایام کی مروڑی ہیں

اور جب قاسمی خود آگہی کے مقام تک آ گئے تو دکھوں کے ساتھ مکمل سمجھوتہ کر لیا اور ہمیشہ کے لئے پرامید رہنا سیکھ لیا۔ اور دراصل یہی ندیم کا بڑا پن ہے۔

میرا احساس مجھ سے کہتا ہے
وقت رستہ بدلتا رہتا ہے

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قاسمی کے لہجے میں طوفانوں کی سی تندہی اور تیزی آتی چلی گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سوچوں کا طوفان زمین سے آسمان تک چھا جانا چاہتا ہے۔ قیامت کے یہ آثار "جلال و جمال" سے لے کر "دشت وفا" تک ہمیں ایک تسلسل سے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں ندیم کا لہجہ ضرور تبدیل ہوا ہے لیکن وہ کمال و تکمیل کی راہ پر پوری قوت سے آگے بڑھے ہیں ان کے عزائم میں جوش اور سوچ میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔

کائنات ایک کھلونا ہے میری نظروں میں
جی میں جس طرح بھی آئے گی گھماؤں گا اسے
اس میں گوندھے ہوئے جوہر کو پرکھنے کے لئے
گاہ توڑوں گا اسے گاہ بناؤں گا اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانوں کو امیدوں، خوشیوں اور بہاروں کی نوید دینا قاسمی کا اولین مشن ہے۔ مثلاً

سفینہ محو سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی
سینہ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گلزار
اتنی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

ان کے نزدیک انسان کے ارادوں میں بے پناہ قوت پوشیدہ ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ اس کائنات میں عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے کیونکہ انسان نے ازلی و ابدی حسن کا انکشاف کیا ہے۔

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے　　تو نم ہے، نمو کا پاسبان وہ
تو آگ ہے اور وہ اجالا　　تو دشت ہے وہ چراغ لالہ
انساں نے تجھے حسین بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

ان میں وطنیت پرستی بھی نظر آتی ہے اسی لئے انہوں نے قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی بہت مدد کی اور ان کی ہر طرح مدد کر کے انسانیت کی خدمت کی۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے وہ اس جذبے کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کئی نظمیں وطنیت کے موضوع پر لکھی ہیں مثلاً لوح خاک میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

سارے رشتے ہیں وطن اور زمیں کے محکم
میں نے اڑتے ہوئے دیکھے ہیں یہ پرچم باہم
جن کو معلوم نہ تھا راز جہاں داری عشق
تربتیں ہیں انہی اقوام کی، تاحد عدم
نہ ہوائے زر و گوہر، نہ غم دام و درم[۱۳]

اس کے علاوہ ان کے خیال کے مطابق وطن کے لئے اگر جان بھی قربان کرنی پڑے تو دریغ نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر مشکل وقت میں اس کو نکھارنا چاہئے۔ ہر دم اس کی خیر خواہی اور بہتری کے لئے دعا کرنی چاہئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طوفان ہے اگر گھر کے در پے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو!
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

کیونکہ ان کے خیال کے مطابق انسان ہی وہ واحد ہستی ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے اس چیز کو وہ شعر میں بڑی خوبصورتی سے کہتے ہیں۔

انسان کے قبضہ قدرت میں اک نطق نہیں ہے، بہت کچھ ہے
ہونٹوں سے نہ نکلے بات اگر، آنکھوں سے سناؤ، کچھ تو کرو

یہی انفرادیت ان کے اسلوب فن میں جھلکتی ہے جہاں کہیں غم دوراں کا ذکر آیا ہے اس میں ایک آن اور خودداری ہے لیکن انھوں نے طلسم جبر کو توڑا ہے، خود پر بے خودی طاری نہیں کی۔[۱۴]

اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ قاسمی کے مزاج کا تعین آغوش مادر ہی میں ہو گیا تھا۔ جس کا اظہار آگے چل کر ندیم کے کردار و گفتار سے ہوتا ہے۔

دستک سے دست فن کو نہ آلودہ کر ندیم
سب جا رہے ہیں جانب در تو مگر نہ جا

اس شعر کی حقیقت ۱۹۸۵ء میں کھل کر سامنے آئی جب صحافت ایوب آمریت کا شکار ہوئی۔ غالباً ۱۹۵۹ء میں جب ان کے دیگر رفقائے کار عتاب کا نشانہ بنے تو افسران بالا قاسمی کو بدستور امروز کا ایڈیٹر رکھنے پر مصر تھے۔ اس سلسلے میں بعض برگزیدہ ہستیوں نے قاسمی کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مفاہمت پر راضی نہ ہوئے آخر حکام کو ان کا استعفیٰ قبول کرنا پڑا۔ طبیعت کا یہ استغنا قاسمی کی شخصیت کا بنیادی جزو ہے مگر لہجے کی ملائمت اور نرمی کے باوصف قاسمی کو اپنی آواز کی سچائی پر اعتماد ہے۔ وہ اپنے شیشہ پندار کو سلامت رکھتے ہیں مگر ان کی صدا کا پتھر آئینہ خانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

مختصر یہ کہ احمد ندیم قاسمی زندگی کو برتنے کا فن جانتے ہیں۔ زندگی حقائق کا دوسرا نام ہے اس میں خوشی کے ساتھ غم، پھول کے ساتھ کانٹے، راحت کے ساتھ تکلیف اور محبت کے ساتھ ظلم بھی ہے۔ زندگی کا دوسرا رخ جو منفی ہے اور جو کمزور دلوں کے حوصلے پست کر دیتا ہے وہ بھی اتنا اہم اور حقیقی ہے جتنا کہ حوصلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افزا اور مثبت رخ۔ ندیم نے جہاں پھولوں کو سراہا ہے۔ وہاں کانٹوں سے بھی رخ نہیں موڑا۔ تکلیف کا سامنا کرنے سے کتراتے نہیں، اور نہ ہی آہ و بکا کی ہے۔ استقامت سے سب کچھ برداشت کیا ہے۔ بے ترتیبی میں ترتیب اور نکھار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے دونوں رخوں کو ایک متوازن سطح پر رکھا اور سمجھا ہے۔ ان کے امتزاج اور امتیاز سے ان کی انفرادی اہمیت اور باہمی تعلق واضح کیا ہے۔ زندگی بے شک اہم ہے مگر ابدی نہیں۔ یہ اپنے منطقی انجام یعنی موت تک ضرور پہنچتی ہے اور اس میں گم ہو جاتی ہے۔

وہ ٹوٹ کے بجھ گئے شرار آخرکار
وہ چہرہ گل ہے پر غبار آخرکار
ہر چیز ابد کا ورد کرتی اٹھی
ہر چیز کو مل گیا فرار آخرکار

قاسمی نے حقیقت کو جلال و جمال کے آئینے میں دیکھا اور نہایت متاثر کن انداز میں بیان کیا

کیکروں کے سفید کانٹوں پر
یوں اٹکتے ہیں پیلے پیلے پھول
جیسے نیزوں میں ہوں پروئے ہوئے
حریت دوست، نوجوان مقتول

منزل و مقصود کے حصول میں ناکامی، بے نشان راستوں کا سفریا انجام زندگی، جینے کے عزم کو شکستہ نہیں کرتا۔ موت بے شک برحق ہے مگر زندگی کو ٹھکرا کر اس کی تمنا نہیں کی جائے گی۔ "ولولہ حیات" میں کہتے ہیں۔

جانتا ہوں زندگی کی انتہا تاریک ہے
لیکن آخر مسکرانے سے کروں پرہیز کیوں

زندگی کا حاصل محض ناکامیاں نہیں ہو سکتیں۔ خیال کی بلند اڑانیں اگرچہ ہمیشہ ستارے توڑ کر نہیں لے آتیں مگر احساس کو الفاظ کا روپ دے سکتی ہیں۔ الفاظ کی یہ لڑیاں ہی بہتر زندگی گزارنے کے لئے نئے معیاروں کی بنیاد بنتی ہیں۔ یہاں پھر قاسمی نے دو متضاد رویوں کو یکساں قبولیت کے ساتھ اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ جینے کا عزم بھی ہے، روشنی کے دیئے جلانے کی بات بھی ہے اور اس ضمن میں اعتراف شکست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی۔

لہو لہو ہے اگر زندگی تو کیا غم ہے
مری شکست بنی سجدہ گاہ ذوق سلیم
اگرچہ گیت محبت کے ناتمام رہے
صدائیں آتی ہیں آفاق سے ندیم! ندیم[۱۵]

موضوعات کتنے ہی متنوع کیوں نہ ہوں اظہار اتنا ہی خوبصورت اور بیان میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری میں قطعات ہوں یا رباعیات، ترائیلے ہوں یا مختصر نظمیں، ہر جگہ لطیف جذبات اور مشکل مضامین کا بیان فنکارانہ مہارت کے ساتھ ملتا ہے۔ فطرت کی منظر کشی دیکھنی ہو تو تصور یا "مرغزار و جو یبار" جیسی نظموں اور ایک آرزو جیسے قطعات میں دیکھئے مثلاً جو ئبار کے دو شعر

ہائے وہ پریوں کے ایواں، ہائے وہ سیمیں کنول
جھیل سے چمٹے ہوئے لرزاں نظاروں کے قریب
چار سو ترشی ہو، سبزے پیاری کیاریاں
راہ پر گنجان نیموں کی قطاروں کے قریب

اسی طرح منفرد دیہاتی فضا کی عکاسی بھی جابجا ملتی ہے مثلاً گاؤں کی شام، وقت کی واپسی، اجاڑ اور ترک محبت کے بعد ان کے علاوہ بے شمار ایسے قطعات ہیں جن میں گاؤں کی زندگی جیتے جاگتے کرداروں، پگڈنڈیوں، پہاڑوں اور لہلہاتے کھیتوں سمیت نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں مٹی کی جو مہک ہے وہ کہیں نہیں ملتی۔ زمین کے ساتھ گہرا اور ابدی رشتہ وہاں کے باسیوں کے مسائل اور طرز زندگی ان کی شاعری کا اہم جز ہے۔

صاف کھلیان پہ غلے کا سنہری انبار
چار سو بیٹھے ہیں دہقان، تھکے ہارے سے
ڈوبتے چاند کے ہالے میں ہوں جیسے تارے
روئے روئے سے پریشان سے، بے چارے[۱۶]

اس کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی کا احترام آدمیت، خود اپنی ذات کے احترام سے شروع ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہونے کے اعتبار سے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بھرپور آگاہی حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی خودداری کا سودا کبھی نہیں کیا۔ کیونکہ یہ وہ دولت ہے کہ جس سے ناموس فن کی حفاظت کی ضمانت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مل سکتی ہے۔ "شاعر اور شعر" میں انہی خیالات کا اظہار ایک عزم صمیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ حق کی آواز اٹھانے کی جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے، آواز مدھم نہیں پڑنی چاہئے۔ شاعر کو "دست بہ زنجیر" تو کیا جا سکتا ہے مگر شعر کو نہیں ۱۷

ان کی انہیں شعری اور شخصی خصوصیات کے باعث جب بھی خیال آیا ہے ذہن میں ملٹن اور اس کی تصنیف Samson Agonistes ضرور ابھر آئے ہیں یہ منظوم ڈراما ایک لحاظ سے ملٹن کی اپنی داستان حیات ہے "Agonistes" یونانی اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم ہے دوڑ میں حصہ لینے والا ملٹن نے اسے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے کہ عرصہ حیات میں لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر حصہ لیتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک راسخ العقیدہ مسیحی ہوتے ہوئے مادی سہولتیں حاصل کرنے کی دوڑ ملٹن کے دائرہ تصور سے باہر تھی اس کا سمسن ایک ایسا ہیرو ہے جس کی دوڑ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کرنا، ان مایوسیوں سے بددل نہ ہونا جو اس جدوجہد میں اکثر راہزنی کرتے ہیں اور ان ترغیبات کی زلیخاؤں سے دامن بچا کر نکل جانا، جس سے خارجی ماحول میں واسطہ پڑتا ہے کیونکہ قاسمی صاحب کا کلام ہی اس کی تصدیق نہیں کرتا کہ وہ بھی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں بلکہ ملٹن کی طرح ان کی اسیری بھی اس کی گواہی دیتی ہے وہ دونوں مذہبی مزاج رکھتے ہیں اگرچہ قاسمی صاحب میں وہ Puritanism نہیں ہے جس کا ملٹن مبلغ رہا لیکن وہ کائنات میں کسی قوت کے حسن ربط کے قائل ضرور ہیں۔

المختصر یہ کہ انہوں نے عمر کے کم و بیش ۶۰ سال اردو کی خدمت میں صرف کئے ہیں اور اب بھی ان کا قلم جس سرعت رفتار سے نہ صرف شاعری بلکہ مختلف النوع ادب کی تخلیق میں مصروف ہے۔ جن کی اہمیت اب تک موجود ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، افسانہ، مقالہ، مزاح غرض ہر طرح کی خدمت وہ انجام دے رہے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے وہ نہ صرف اہم شاعروں میں سے ہیں اور صف اول کے افسانہ نگار ہیں بلکہ صحافت میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے اور شعر و شاعری کی تاریخ میں ان کا نام زندہ جاوید رہے گا اور افسانوی ادب میں ان کی نظیر نہیں ملتی اور اس کے ساتھ ساتھ صحافت ان کے دست و قلم سے ہمیشہ مستفید ہوتی رہے گی اور مزاح نگاری میں بھی ان کا ایک لازوال کردار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ص ۱۱۔۱۳

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۳۔ ایضاً۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ احمد ندیم قاسمی، رم جھم، لاہور، ۱۹۴۴ء۔

۷۔ ایضاً، دشت وفا، لاہور، ۱۹۶۴ء۔

۸۔ ایضاً، جلال و جمال، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ص ۲۳۴۔ ۳۵

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً، خاک لوح، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۴

۱۱۔ ایضاً، رم جھم، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۱۱۳

۱۲۔ ایضاً، دشت وفا، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۳۶

۱۳۔ فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۹۳

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، خاک لوح، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۱۵۔ وحید عبدا، جدید شعرائے اردو، تیسرا حصہ، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، فنون، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۴۳

۱۷۔ صہبا لکھنوی، افکار، کراچی، ۱۹۴۵ء، ص ۶۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادارہ کی مطبوعات

۱-پاکستان کاقدیم رسم الخط اور زبان	رشید اختر ندوی	۳۰۰ روپے
۲- گفتار قائداعظم	مرتبہ احمد سعید	۶۰ روپے
۳- فاطمہ جناح، حیات و خدمات	ڈاکٹر آغا حسین ہمدانی	۸۰ روپے
۴- حیات قائداعظمؒ: چند نئے پہلو	احمد سعید	۳۰ روپے
۵- مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگذشت کابل	مرتبہ غلام مصطفیٰ خان	۴۰ روپے
۶- اسلام کی انقلابی علمی تحریک	عبید اللہ قدسی	۲۰ روپے
۷- جمعیت العلماء ہند- دستاویزات (۲ جلدیں)	مرتبہ پروین روزینہ	۱۲۵ روپے
۸- کتابیاتی اشاریہ پاکستان ۱۹۷۹ء	مرتبہ شفیع النساء	۵۰ روپے
۹- خاکسار تحریک اور آزادی ہند	مرتبہ ڈاکٹر اے- ڈی مضطر	۱۲۰ روپے
۱۰- کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد	مرزا شفیق حسین	۱۰۰ روپے
۱۱- قائداعظمؒ اور راولپنڈی	منظور الحق صدیقی	۳۰ روپے
۱۲-پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار	ایچ بی خان	۱۲۵ روپے
۱۳- جنگ آزادی کے اردو شعراء	محمود الرحمان	۱۲۰ روپے
۱۴- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۲ جلدیں)	مرتبہ ڈاکٹر آغا حسین ہمدانی	۲۰۰ روپے
۱۵- قائداعظمؒ کے رفقاء سے ملاقاتیں	مرتبہ سید ذوالقرنین زیدی	۷۰ روپے
۱۶- آہنگ باز گشت	محمد سعید	۱۱۰ روپے-
۱۷- سفرنامہ ابن بطوطہ	مترجم پیرزادہ محمد حسین	۷۵ روپے
۱۸- آزاد کشمیر ایک سیاسی جائزہ	مرزا شفیق حسین	۲۵۰ روپے
۱۹- پیر صاحب مانکی شریف	وقار علی شاہ	۷۰ روپے
۲۰- وارث شاہ: عہد اور شاعری	عذرا وقار	۴۵ روپے

© rasailojaraid.com